میں ایک نگ کا اور اضافہ ہو گیا۔ یہ نگ کیسا تھا' ناصر ہی سے سن لیجئے۔

''حفیظ اچھا غزل گو' پرانے خیال کا آدمی ہے۔ علوم وفنون کے ادق انداز میں اپنی کمزور اور بے جان شخصیت کو چھپا رکھا ہے۔ آنکھیں ذہین چمکدار' سیاہ رنگ' گالیں پچکی ہوئیں' سفید بال' کہیں کہیں سیاہی بھی' پتلا دبلا' مخلص اور وضعدار' میرا پیارا دوست ہے۔''

یہ پیارا دوست روز رات کو پیدل چل کر میٹرو پہنچتا۔ ناصر سے شاعری کی باتیں۔ شیخ صلاح الدین سے کچھ علم وتحقیق کے ذکر اذکار۔

ناصر نے پیدل دیکھ کر ایک روز پوچھا''آپ پیدل کیوں آتے ہیں۔ آپ کی موٹر کو کیا ہوا۔''

حفیظ صاحب بولے''کیا بتاؤں۔ میری موٹر میرے کہنے میں نہیں۔ میں اسے سٹارٹ تو کر سکتا ہوں۔ چلا سکتا ہوں۔ مگر میٹرو کے سامنے اسے رکنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔''

حفیظ صاحب کی موٹر صرف ایک رستے پر چلنے کی عادی تھی۔ نسبت روڈ سے چل کر جہاں حفیظ صاحب رہتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے احاطہ میں جا کر خود بخود رک جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رستے میں کوئی ملاقاتی نظر آیا۔ حفیظ صاحب نے موٹر کو بریک لگائے۔ مگر موٹر بکٹ دوڑتی چلی گئی اور اپنی منزل ہی پر جا کر رکی۔ بس ایک مرتبہ وہ بریک کو خاطر میں لائی تھی اور رستے میں رک گئی تھی۔ مگر پھر اس نے سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔

حفیظ صاحب کی موٹر حفیظ صاحب کے کہنے میں نہیں تھی۔ مگر اعداد ان کے بہت کہنے میں تھے۔ بس آپ کے منہ سے فقرہ نکلا اور حفیظ صاحب نے فقرہ پکڑا اور لہک کر بولے''لو تاریخ نکل آئی۔'' بیٹھے بیٹھے یہی کرتے رہتے تھے۔ بات کرتے کرتے کوئی مصرعہ پڑھا' تڑپ کر بولے''ارے یہ تو تاریخ نکل آئی۔'' دوسرے کی زبان سے کوئی فقرہ نکلا۔ فقرے کو چٹکی سے پکڑا اور جھٹ سے اس سے تاریخ برآمد کر دی۔ ذکر ہو رہا تھا کہ ناصر کی شادی ہو گئی۔ اب وہ پابند ہو گیا۔ پابند کے لفظ کو پکڑ لیا۔ بولے شادی کی تاریخ نکل آئی ''پابند ناصر کاظمی۔''

جس ذوق وشوق سے تاریخ نکالتے تھے اسی ذوق وشوق سے یاروں کی ہجویں کہتے تھے۔ کسی بھی دوست پر کسی بھی موقعہ پر رواں ہو جاتے۔ پھر چل سو چل۔ شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں علم وفضل کی ہو رہی تھیں۔ مگر ایک دفعہ جو پڑی بدلی تو بس چل نکلے۔

آ شیخ صلاح الدین

جا شیخ صلاح الدین

پنجابی میں وہ بولا
پا شیخ صلاح الدین

میں نے کہیں پیچھے ذکر کیا ہے کہ شیر محمد اختر اور رضی اختر نے مل کر دکان کھولی تھی۔ دکان کا نام تھا اختر اور اختر۔ حفیظ صاحب کو نام پڑھ کر گدگدی ہوئی۔ اور جو لکھ ڈالی۔ اس وقت مجھے پوری ہجو یاد نہیں آئی تھی۔ اب یاد آئی ہے تو سن لیجئے۔

رضی سے جب یہ پوچھا شغل کیا ہے
وہ بولے جی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں
خریدوں گا نہ میں ان سے کتابیں
بہت مہنگی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان میں ایک عاشق ایک معشوق
فقط جنسی کتابیں بیچتے ہیں

ریڈیو کے دوستوں سے سنا کہ جب شوکت تھانوی نے دوسری شادی کی تو ان کے بڑے صاحبزادے غصے سے بھرے ریڈیو سٹیشن پہنچے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے 'ابا جی اگر یہ خرمستی...... بس اتنا ہی کہا تھا کہ حفیظ صاحب جو اس مبارک گھڑی میں وہاں موجود تھے اچھل پڑے اور بولے "بس بس۔ تاریخ ہو گئی۔ "ابا جی خرمستی" سے شادی کی تاریخ نکلتی ہے۔"

مگر حفیظ صاحب کا اصلی کام تو ان کی غزلیں تھیں۔ اور اس کام کو انہوں نے کبھی سمیٹا نہیں۔ جب یار پوچھتے کہ حفیظ صاحب آپ کا مجموعہ کب شائع ہو رہا ہے۔ جواب دیتے' ریٹائر ہو کر جو جو کام میں نے کیے ہیں ان سب کو سمیٹوں گا۔ ریٹائر بھی ہوئے۔ اپنے بکھرے کلام کو سمیٹا بھی۔ مجموعہ پھر بھی شائع نہ ہوا۔ جب انتقال ہو گیا تو ضیا جالندھری نے مظفر علی سید کو الزام دیا کہ حفیظ صاحب نے اپنی غزلیں یکجا کر کے اس کے حوالے کی تھیں کہ ذرا ترتیب دیکھ لو۔ اس نے مسودہ دبا لیا۔ کتاب چھپتی کیسے۔ لیجئے مظفر اور ضیا میں ٹھن گئی۔ بندہ اس باب میں یہ کہتا ہے کہ اس کے ذمہ دار خود حفیظ صاحب ہیں۔ انہوں نے نیکی کر کے کونسے دریا میں ڈالی۔ مظفر تو وہ اتھاہ دریا ہے کہ خود اس کی نیکیوں کا پتہ نہیں چلا کہ کونسی تہہ میں سما گئیں۔ لکھ لکھ کر مضامین تو کے انبار لگا دیئے۔ مگر کتاب چھپنے کی نوبت نہیں

آنے دی۔ اگر کسی طور آ بھی گئی تو کوئی بڑا سا روڑا اٹکا دیا۔ حفیظ صاحب کا مسودہ مظفر کے پاس۔ یعنی کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔

اچھا ایک حفیظ کا ذکر آیا ہے تو تھوڑا ذکر دوسرے حفیظ کا بھی ہو جائے۔ اصل میں لاہور شہر نے دو حفیظوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ایک ہوشیار پور والے حفیظ کی' دوسرے جالندھر والے حفیظ کی۔

ابوالاثر حفیظ نے غزلیں لکھیں' گیت لکھے' شاہنامہ اسلام لکھا۔ ان سب میدانوں میں اپنا لوہا منوایا۔ بقول خود اہل زباں کب مانتے تھے' ان سے بھی اپنے آپ کو منوایا۔ مگر میں نے انہیں ان کے ایک اور ہی ادبی کارنامہ کے واسطے سے جانا اور مانا۔ خیر اس کا ذکر تو ذرا ٹھہر کر کروں گا۔ پہلے تو مجھے یہ بتانا چاہیے کہ میرا ان سے تعارف کہاں اور کیسے ہوا۔ اسی شہر میں رہتے تھے مگر میں ان سے بیگانہ چلا آتا تھا۔ ادبی محفلوں میں وہ آتے نہیں تھے۔ مشاعروں میں' میں جاتا نہیں تھا۔

مکتبہ جدید کے بک سٹال پر ایک صاحب ہوا کرتے تھے' علاء الدین منظہر۔ سہگل کے عاشق صادق تھے۔ سہگل سے اپنا رشتہ یہ بتاتے تھے کہ جالندھر میں اس کے گھر کی دیوار سے ان کی گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ دوسرے رشتہ دار حفیظ جالندھری جوان کے ماموں تھے۔ سال کے سال بڑے اہتمام سے سہگل کی برسی مناتے۔ پوری گلی میں جھنڈیاں لگائی جاتی۔ گھر کی بیٹھک میں سہگل کی ایک بڑی سی تصویر اس طرح سجائی جاتی کہ اس پر گیندے اور گلاب کے گجرے لاد دیئے جاتے۔ اگر بتیاں سلگائی جاتیں۔ پھر بیچ میں ایک گراموفون رکھا جاتا جو شاید سہگل ہی کے زمانے کا تھا اور جسے وہ ضرور جالندھر سے لے کر آئے ہوں گے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سہگل کے وہ ریکارڈ جو ہز ماسٹرس وائس کے پاس بھی محفوظ نہیں ہیں ان کے پاس موجود ہیں۔ جس خضوع وخشوع سے وہ یہ برسی مناتے تھے اسی خضوع وخشوع کے ساتھ میں وہاں پہنچتا اور سہگل کے سارے ریکارڈ سن کر آتا۔ ایک برس ماموں نے بھانجے کو اور بھانجے کے ساتھ سہگل کو نوازا اور اس تقریب میں ورود کیا۔ میں نے ذرا چھیڑا تو رواں ہو گئے۔ ہمعصروں میں سے کسی ایک کو جو مان کے دیا ہو۔ جوش کے متعلق کہنے لگے کہ ''بندہ خدا کو بس لغت حفظ ہے۔ لفظوں کی اتنی بھرمار ہے کہ معنی غائب ہو جاتے ہیں۔'' اور پھر کتنے پتہ کی بات کہی کہ ''زبان محض لفظوں سے عبارت نہیں ہوتی۔ زبان میں اصل چیز لہجہ ہے۔ میں چونکہ پنجابی ہوں اس لیے میں نے لفظ اور لہجہ پر بہت غور وفکر کیا ہے۔ لکھنو جا کر وہاں کے گلی کوچوں میں گھوما پھرا اور زبان سنی۔ زبان تو وہی ہوتی ہے جو گلیوں اور بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ میں کھلے کانوں کے ساتھ لکھنو' دلی' علی گڑھ گیا اور زبان کو اپنے اندر اتارا۔ میں کہتا ہوں کہ لکھنے والا یا تو کسی زبان کو اختیار نہ کرے۔ اختیار کرتا ہے تو اس کا حق ادا کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دلی میں اکیس لہجے ہیں اور لکھنو میں صرف تین۔ میں نے ان لہجوں کو جانا اور سمجھا ہے۔ اب جو نوجوان جدید شاعری فرما رہے ہیں ان کے یہاں نہ شاعری ہے نہ زبان۔ اس جدیدیت کے استاد ہیں جناب فیض احمد فیض'' رکے۔ پھر بولے۔ ''اور یہ نثری نظم۔ میرے عزیز شعر کو وزن میں رکھنے کے لئے اتنا ہی دکھ جھیلنا پڑتا ہے جتنا عورت کو

بچہ جننے میں جھیلنا پڑتا ہے۔ بلکہ شعر کہنے میں شاعر جس درد سے گزرتا ہے وہ دردزہ سے بڑھ کر ہے۔"

بس اس کے چند ہی دنوں بعد ان کی طرف سے مجھے ایک کتاب موصول ہوئی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ "اس کتاب کا اول سے آخر تک جلد از جلد مطالعہ فرمالیں اور بعد ازاں اپنی رائے سے دنیا کو بتادیں کو شاہنامہ اسلام کے مصنف نے چیونٹی نامہ کیوں اور کیسا لکھا ہے۔"

اور بندہ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دنیا کو (ہماری دنیا سے لے دیکے اردو کی دنیا ہے) بتا دینا چاہتا ہے کہ شاہنامہ اسلام برحق مگر جس نے "چیونٹی نامہ" نہیں پڑھا وہ حفیظ سے بیگانہ ہے۔ میں نے شاعر اسلام کا یہ نثری شاہکار پڑھا' چیونٹی نامہ یعنی "ایک مہذب و متمدن مخلوق" کی داستان حیات اور حفیظ صاحب کی عظمت کے آگے سر جھکا دیا۔

میں نے حفیظ صاحب کو زیادہ قریب سے نہیں دیکھا لہٰذا اس کے بارے میں جو اچھی بری باتیں کہی جاتی ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک واقعہ سے میں نے یہ جانا کہ یہ بزرگ اپنی طرز کا وضعدار تھا اور پرانے تعلقات کا اس کے یہاں بہت پاس تھا۔

واقعہ اس طرح ہے کہ صلاح الدین محمود ایک دن ایک نوجوان کو ساتھ لے کر میری طرف آئے۔ لمبا قد' چھریرا بدن' گوری رنگت' ڈاڑھی کسی قدر بڑھی ہوئی' چہرے پر کچھ کچھ وحشت کے آثار۔ تعارف کرایا کہ یہ میرے علی گڑھ کے زمانے کے دوست ہیں۔ اب ملاقات ہوئی ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ رشید احمد صدیقی کے بیٹے ہیں۔ میرا مطلب ہے چھوٹے بیٹے۔ مشرقی پاکستان کی ابتلا میں مکتی باہنی والوں کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان سے بچ کر خراب و خستہ ہوتے ہواتے پاکستان پہنچے ہیں۔ باقی اپنا یہ احوال خود سنائیں گے۔"

اس عزیز نے اپنا احوال سنایا۔ شرٹ کے بٹن کھول کر اپنا بدن دکھایا۔ جا بجا زخموں کے نشان۔ پھر اپنے احوال کے دفتر کو سمیٹ کر اچانک مجھ سے پوچھا "آپ ریوتی سرن شرما کر جانتے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ کیوں۔"

"میں اس واسطے سے آپ کو جانتا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی باغی بہن سے قطع تعلق نہیں کیا۔ بہن بہنوئی سے تمہارا ربط و ضبط تھا۔"

"قطع تعلق کیا معنی' میں نے تو اس کام میں بہن کی مدد کی تھی۔"

خیر میں نے اس جوان عزیز کا احوال اپنے کالم میں بیان کیا۔ دوسرے دن دفتر پہنچا ہی تھا کہ ایک فون آیا۔ اس شہر میں رشید احمد

صدیقی کے کتنے مداح' شاگرد اور ہمعصر ہوں گے۔ مگر مجھے ایک فون آیا۔ وہ حفیظ صاحب کا تھا۔ رقت بھری آواز میں بول رہے تھے ''رشید صدیقی میرا یار تھا۔ علی گڑھ جاتا تھا تو اسی کے گھر ٹھہرتا تھا۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس بچہ کو دیکھا ہے۔ اس کا حال پڑھ کر میرا دل کٹ گیا۔ رشید صدیقی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر میں بیٹھا ہوں۔ اس سے کہو کہ اس شہر میں تمہارا ایک چچا ہے۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ اسے میرے پاس بھیجو۔''

اگلے دن جب وہ آیا تو میں نے اسے حفیظ صاحب کا پیغام دیا اور تاکید کی کہ ان سے جا کر ملو۔ وہ وہاں گیا۔ اور پھر لاہور جتنے بھی دن رہا اسی گھر میں رہا۔ مگر واقعات نے اس جوان عزیز کو خفقانی بنا دیا تھا۔ ایک روز بے کہے سنے چلا گیا۔ پھر شاید کراچی کی طرف نکل گیا۔ حفیظ صاحب کا مجھے فون آیا۔ وہ اس کی اس حرکت پر بہت آزردہ تھے۔

◆◆◆

نئی نسل کا شگوفہ، نوخیز ادیبوں مصوروں کی مسکوٹیں

ناصر کاظمی کی ڈائری سے ایک ورق:

22 مئی 1953ء۔۔۔۔۔۔۔۔پاک ٹی ہاؤس میں ''بزم خیال کی بنیاد رکھی۔

یکم جون۔۔۔۔۔۔۔۔''تحریک خیال'' کی تجویز پر غور۔

2 جون۔۔۔۔۔۔۔۔تحریک خیال کی بنیادی کمیٹی کا اجلاس۔شیخ صلاح الدین صاحب صدر' احمد مشتاق خزانچی' انتظار حسین سکریٹری' حنیف رامے اور شاکر علی نے بھی شرکت کی۔

3 جون۔۔۔۔۔۔۔۔ٹی ہاؤس میں نئی نسل کے لکھنے والوں کا اجتماع۔

4 جون۔۔۔۔۔۔۔۔شیخ صاحب نے منشور پیش کیا۔

11 جون۔۔۔۔۔۔۔۔Heat Wave, Art Wave, & Palmistry Wave

میٹرو میں رات کے بارہ بجے تک حنیف رامے کی صدارت میں تحریک خیال کمیٹی کا اجلاس۔یہ غزل کہی۔

''چاند جب پہلی رات کا دیکھا''

بزم خیال' تحریک خیال' نئی نسل۔لو میں تو بھولا ہی جا رہا تھا۔ناصر نے یاد دلایا اور اب آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔مگر سب کچھ کہاں۔کتنی باتیں ذہن سے بالکل اتر چکی ہیں۔مثلاً ''خیال'' کا اجرا تو یاد ہے۔تحریک خیال کے متعلق ذہن پیچھے کی طرف دوڑا رہا ہوں۔تفصیلات بالکل یاد نہیں آ رہیں۔بہر حال یہ سب نئی نسل کے خیال کی گلکاریاں تھیں۔مگر نئی نسل چہ؟

رتجگوں کو آخر رنگ لانا ہی تھا۔تخلیقی درد سے بھری یہ راتیں ضائع کیسے چلی جاتیں۔آخر کوئی بے قراری تو تھی کہ یار تپتی دوپہروں میں اور جاڑے پالے کی راتوں میں یوں مارے مارے پھرتے تھے اور ناصر نے تو اپنی شب بیداری کے جواز میں ایک فلسفہ بھی تراش رکھا تھا کہ تخلیق کا در دراصل میں رات کی امانت ہے۔تخلیق کا ہر جادو رات کے سناٹے میں جاگتا ہے۔تو ادھر رات کے یہ مسافر تخلیق کے جذبے سے سرشار پھرتے تھے ادھر عسکری صاحب ادبی جمود کی سنادنی سنا رہے تھے۔تو ان یاروں کے بیچ یہ سوال اٹھنا ہی تھا کہ یہ عسکری صاحب کس ادبی جمود کی بات کر رہے ہیں۔جو لکھ رہا ہو تخلیقی امنگ لیے پھرتا ہو وہ کیسے مانے گا کہ ادبی جمود ہے۔

یاروں نے کہا کہ شاید وہ نسل جس کے ساتھ عسکری صاحب جوان ہوئے تھے جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ مگر ہم تو نئی نسل ہیں۔ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہم نے ادب میں آنکھ کھولی ہے۔

یہ بات ٹی ہاؤس سے چلی اور کافی ہاؤس تک پہنچی۔ کافی ہاؤس میں تو پہلے ہی ہنڈیا پک رہی تھی۔ نوخیز مصوروں کی ٹولی اپنے بزرگوں سے امادہ بغاوت تھی۔ تجریدی مصوری کی کھچڑی کھد بد کر رہی تھی۔ انہیں دنوں ایک مصور نیا نیا شہر میں وارد ہوا تھا۔ ایک دوپہر میں نے ٹی ہاؤس میں جھانکا تو وہاں کسی یار کو نہ پا کر کافی ہاؤس کا رخ کیا۔ وہاں جھانکا تو دیکھا کہ ایک میز پر ایک اجنبی گم سم بیٹھا ہے اور مظفر علی سید نئی مصوری کے موضوع پر رواں ہے۔ میں بھی جا شامل ہوا۔ کتنی دیر ہی منظر دیکھتا رہا کہ وہ شخص نہ منہ سے بولتا ہے نہ سر سے کھیلتا ہے۔ ہونق بنا مظفر کا منہ تکتا ہے۔ اور مظفر ہے کہ نئی مصوری کے مضمون پر جاری و ساری ہے۔

جب ہم دونوں کافی ہاؤس سے نکلے تو میں نے پوچھا ''مظفر یہ کون صاحب تھے۔''

''یہ صاحب'' مظفر نے مجھے ایسا دیکھا جیسے میری جہالت پر ماتم کر رہا ہو'' یہ شخص ایشیا کا سب سے بڑا تجریدی مصور ہے۔ شاکر علی۔'' مظفر نے یہ بیان اتنی سنجیدگی سے دیا کہ میں آگے کچھ بول ہی نہ سکا۔

ایشیا کا یہ سب سے بڑا تجریدی مصور ابھی صرف کافی ہاؤس میں بیٹھا مہک رہا تھا۔ کافی ہاؤس سے باہر شہر میں ابھی اس کی خوشبو نہیں پھیلی تھی۔ اور ہماری پوری ٹولی کا معاملہ یہ تھا کہ ایک قدم ٹی ہاؤس میں تو دوسرا قدم کافی ہاؤس میں۔ نوخیز مصوروں کے ساتھ مسکوٹیں ہونے لگیں۔ بغاوت کے منصوبے بننے لگے۔

توپیں نصب ہو گئیں۔ دغنے کی دیر تھی۔ نئی نسل کے موضوع پر چائے کی میز پر تو بہت طوفان اٹھ رہا تھا۔ مگر کسی کا قلم ابھی نہیں اٹھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کس رسالہ سے توقع رکھی جائے کہ وہ ہمارے اعلان خود مختاری کو اپنے اوراق میں جگہ دیدے۔ ناصر ان دنوں ''ہمایوں'' کا مدیر تھا۔ مگر سر پہ میاں بشیر احمد بیٹھے تھے۔ جوان کی وضع وہ ہمایوں کی وضع۔ اس رسالہ میں ایسے قصوں کی کہاں گنجائش تھی۔ بہر حال میرا مضمون تو وہاں چھپ گیا۔ وہ مضمون تھا جو میں نے ''پرانی نسل کے خلاف ردعمل'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ پہلے حلقہ میں پڑھا گیا۔ پھر ''ہمایوں'' میں چھپا۔ حلقہ میں شیر محمد اختر مجھ پر گرم ہو گئے۔ کہنے لگے ''یہ ذاتی نوعیت کا مضمون ہے۔ عسکری صاحب نے ابھی پچھلے دنوں تمہارے مجموعہ ''گلی کوچے'' پر معاندانہ تبصرہ کیا۔ یہ مضمون اس کا ردعمل ہے۔''

یہ تو میرے گمان ہی میں نہ تھا کہ مجھ پر یہ الزام بھی آ سکتا ہے۔

جب مضمون ''ہمایوں'' میں چھپ گیا تو میں نے ناصر سے کہا کہ میں نے تو مضمون لکھ دیا۔ مگر تمہیں بھی تو کچھ بولنا چاہیے۔

''میں تو تمہارے مضمون سے پہلے ہی اعلان بغاوت کر چکا ہوں۔''

''وہ کب؟'' میں نے چکرا کر پوچھا۔

''عجب سادے آدمی ہو تم۔ میری غزل ''سر مقتل بھی صدا دی ہم نے'' تم نے نہیں پڑھی۔ اس میں تو نام لے لے کر پرانی نسل کو رد کیا گیا ہے۔''

اس غزل کو پڑھتے ہوئے پچھلی نسل کے نامور شاعروں کے مجموعوں کے ناموں کو ذہن میں رکھئے۔

سر مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے
پہلے اک روزن در توڑا تھا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے
پھر سر صبح وہ قصہ چھیڑا
دن کی قندیل بجھا دی ہم نے
آتش غم کے شرارے چن کر
آگ زنداں میں لگا دی ہم نے
رہ گئے دست صبا کملا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے
آتش گل ہو کہ ہو شعلہ ساز
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے
کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینہ نو میں چھپا دی ہم نے
دم مہتاب فشاں سے ناصر
آج تو رات جگا دی ہم نے

''قندیل'' قیوم نظر کا مجموعہ کلام۔ ''زنداں'' یوسف ظفر کا مجموعہ۔ ''دست صبا'' فیض صاحب کا مجموعہ۔ ''آتش گل'' جگر صاحب کا اور ''شعلہ ساز'' فراق صاحب کا۔

میں نے یہ جواب سنا اور لاجواب ہو گیا۔

اور لیجئے یہ قصہ چل رہا تھا کہ ہم بھی اک رسالہ کے مدیر بن گئے۔ بس اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر بروقت یہ دولت عطا کی۔ میں تو اورینٹل کالج عبادت صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وہاں ہمارے بزرگ پروفیسر وقار عظیم بھی بیٹھے تھے۔ اور انارکلی کا ایک تاجر اپنی ایک آرزو لے کر ان کے پاس آیا بیٹھا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ ایک ادبی رسالہ نکالے۔ ادارت کے لیے کسی نامور ادیب کی تلاش میں تھا۔ وقار صاحب نے میری صورت دیکھی تو اسے اس گمنام ادیب سے بھڑا دیا۔ میں نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی۔ شام کو ٹی ہاؤس آ کر مظفر اور ناصر کی اس باب میں رائے طلب کی۔ دونوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو۔ دیر مت کرو۔ فوراً جا کر بات کرو۔ ہمیں اس وقت رسالہ کی سخت ضرورت ہے۔ مظفر نے فوراً جیب سے قلم نکالا۔ کاپی کھولی اور رسالہ کا نقشہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ قلم ان دنوں مظفر کی جیب سے ایسے نکلتا تھا جیسے سورمائی زمانے میں بات بات پر ساونتوں کی نیام سے تلوار نکلتی تھی۔ یہاں حال یہ تھا کہ پتہ کھڑکا اور مظفر کی جیب سے قلم نکلا۔ منصوبے نوک قلم پر دھرے رہتے تھے۔ مظفر کے منصوبوں کے مرتب و مدون کیا جائے تو اس کے مضامین کے مجموعوں سے زیادہ ضخیم جلدیں مرتب ہوں گی۔ تو پرچے کا منصوبہ ہاتھ کے ہاتھ تیار ہو گیا۔ اور پرچے کا نام کیا ہو گا۔ مظفر کو فوراً خیال آیا کہ ایک رسالہ خیال تھا۔ اس نام سے پہلے یگانہ نے رسالہ نکالا تھا۔ پھر میراجی نے نکالا۔

''اور اب ہم نکالیں گے۔''

لیجئے سب کچھ طے ہو گیا۔ میں نے اگلی صبح جا کر ہاں کر دی۔

مظفر کے منصوبوں سے خیال آیا..... ایسی زرخیز کوکھ والیاں بھی تو ہوتی ہیں کہ بچے افراط سے جنتی ہیں۔ مگر ان کے جنے جیتے نہیں۔ مگر یہاں تو میری ذمہ داری تھی۔ اس منصوبے کو تو پروان چڑھنا ہی تھا۔ رسالہ نکلنے سے پہلے رسالہ کے اشتہار نے ہنگامہ پیدا کیا۔ اشتہار میں ایک فقرہ کہ ناصر کو سوجھا تھا لکھا گیا ''اس رسالہ کا ایک ایڈیٹر بھی ہو گا۔'' فقرے نے اپنا کام کیا۔ وہ ایسا زمانہ تھا جب رسالوں کے ناشرین اپنے ادیب ایڈیٹروں کو پیچھے ہٹا کر خود ہی ایڈیٹر بنتے چلے جا رہے تھے۔ ان سب کو بگڑنا ہی تھا۔ سب سے زیادہ نذیر چودھری اور محمد طفیل ناراض ہوئے۔ اسی نشیب میں تو خاص طور پر پانی مر رہا تھا۔

خیر پہلے پرچے نے تو داد حاصل کر لی۔ ہاں طے یہ ہوا تھا کہ یہ خالص ادبی پرچہ نہیں ہو گا۔ ادب اور آرٹ دونوں کو اس میں سمیٹا

جائے گا۔ اور یہ کہ ادیبوں کی نئی نسل کے پہلو بہ پہلو کافی ہاؤس میں جو مصوروں کی نئی نسل پر پرزے نکال رہی ہے ان کی بھی یہ رسالہ ترجمانی کرے گا۔ سو پہلے شمارے میں شاکر صاحب کی تصویر اور ساتھ ہی اطالوی مصوری پر ان کا ایک مضمون چھپا تھا۔ یہ گویا اس شہر میں شاکر صاحب کی رسم بسم اللہ تھی۔ دوسرے شمارے میں ان کی ایسی تصویر جو تجریدی رنگ لیے ہوئے تھی چھپی۔ عنوان تھا Bull سانڈ۔ ساتھ میں مظفر کا مضمون ''شدہ کلا'' بس اس کے ساتھ ہی پرچہ اعتراضات کی زد میں آ گیا۔ یہ کیسی تصویر ہے۔ اس میں سانڈ کہاں ہے۔ اور یہ شدہ کلا کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ رسالہ ہے یا شدھی کی تحریک۔

میں ایک دوپہر کو ٹی ہاؤس داخل ہوا تو دیکھا کہ قیوم صاحب اپنے ایک نئے شاگرد کو لیے بیٹھے ہیں۔ قیوم صاحب اب گورنمنٹ کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ کالج سے' نبٹ کر ٹی ہاؤس آتے۔ داخل ہوتے ہی ایک قہقہہ سے اپنی آمد کا اعلان کرتے۔ کوئی نہ کوئی شاگرد ان کی معیت میں ہوتا۔ ان کا طریقہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جو شاگرد ہونہار نظر آتا اسے پہلے ٹی ہاؤس جھنکاتے۔ پھر حلقہ ارباب ذوق میں لے جا کر چھوڑ دیتے۔ جو شاگرد آج اس کے ساتھ آیا تھا وہ جیسے کچی کلی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ بس جیسے پالنے سے اتر کر گھٹنیوں چلتا ٹی ہاؤس میں آن پہنچا ہو۔ میں نے بیٹھ کر ابھی سانس ہی لیا تھا کہ قیوم صاحب چہکے ''انتظار صاحب یہ نوجوان ''خیال'' میں جو تصویر چھپی ہے اس کے بارے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ ہاں بھئی' انتظار صاحب آ گئے ہیں۔ پوچھ لو ان سے۔''

نوجوان نے جھرجھری لی ''یہ پینٹنگ چھپی ہے' سانڈ کا آخر مطلب کیا ہے۔''

میں نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر قیوم صاحب بھلا ایسے کیسے جانے دیتے تھے ''انتظار صاحب' اس نوجوان کو سمجھائیں نا۔ وہ میرا مغز چاٹ رہا ہے۔ یار اسے سمجھاؤ۔''

یہ قیوم صاحب کا خاص اپنا انداز تھا۔ شاگردوں کو ٹی ہاؤس میں اور حلقہ ارباب ذوق میں لا کر ادیبوں سے بھڑا دیتے تھے۔ شاید یہ سوچ کر کہ اس طور ان کا حوصلہ بڑھے گا' تھوڑی تربیت ہو جائے گی۔ اور یہ جو فلاں فلاں بیٹھے ہیں اور مجھے آنکھیں دکھاتے ہیں کچھ ان کی بھی طبیعت درست ہو جائے گی۔ یہ عمل تھوڑے دن چلتا تھا۔ مگر جو واقعی ذہین شاگرد ہوتا تھا وہ اس فضا میں آ کر جلدی ہی بالغ ہو کر خود قیوم صاحب کو آنکھیں دکھانے لگتا تھا۔ اور یہ جو شاگرد اب ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا اس کا نام سعید محمود تھا۔ وہ یہاں پہنچ کر کچھ زیادہ ہی تیزی سے بالغ ہوا۔ قیوم صاحب نے اسے ٹی ہاؤس کا رستہ دکھا دیا۔ یہ اس کے لیے کافی تھا۔ باقی ٹی ہاؤس میں اس نے اپنا مقام خود پیدا کیا۔ دیوانگی کے مراحل اس نے بڑی تیزی سے طے کیے۔ جلدی اسے احساس ہوا کہ قیوم صاحب کی میز تو اس کے لیے بہت تنگ میدان ہے۔ ایک تو یہاں کسی سے پاؤنڈ اور جوائس پر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس میز کے موضوعات تھے ہی نہیں۔ پھر

قیوم صاحب تو شام پڑے ٹی ہاؤس سے رخصت ہو کر گھر چلے جاتے۔ ساتھ میں ان کی ٹکڑی بھی چلی جاتی۔ سعید محمود کی دیوانگی کے تقاضے اس سے بہت زیادہ تھے۔ سو وہ سرکتے سرکتے جلدی ہی میز بدل کر ہمارے بیچ آ گیا اور شیخ صلاح الدین اور مظفر سے سینگ لڑانے لگا۔

شیخ صاحب کا اپنا طریقہ واردات تھا' مظفر کا اپنا۔ خیر شیخ صاحب کا طریقہ واردات تو سیدھا تھا۔ پہلے ہی ہلہ میں مار گرانے کی کوشش کرتے۔ ایلیٹ اور پاؤنڈ' یہ تو شاعر ہی نہیں ہیں۔ اب آپ ان سے بحث کرتے رہیے۔ انہوں نے تو فیصلہ سنا دیا۔ مظفر کا طریقہ واردات پیچدار تھا۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں ایلیٹ ہی کا طوطی بول رہا تھا' تنقید کے حوالے سے بھی' شاعری کے حوالے سے بھی۔ سو ہر پھر کر وہی بحث کا موضوع بنتا تھا۔ مظفر حریف کو کھل کھیلنے کا موقعہ دیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے پکڑتا۔ اس پہ جتاتا کہ تم نے ایلیٹ کو پورا نہیں پڑھا ہے۔ اور جتنا پڑھا ہے اتنی حد تک بھی اسے سمجھا نہیں ہے۔

پھر مظفر کی مار بہت دور تک تھی۔ شیخ صاحب فلسفہ کے میدان میں بیشک مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیں' یونان سے چل کر قدیم ہند' اور قدیم ہند سے اسلام پر آ جائیں۔ مگر ادب میں وہ یورپ سے باہر کم ہی نکلتے تھے۔ مظفر کا یہ عالم کہ ابھی بادیلیر پر ریشہ خطمی ہو رہا ہے اور ابھی اسے چرکپن کا ایک شعر یاد آ گیا۔

کپڑے چرکپن جب بدلتے ہیں
عطر کے بدلے موت ملتے ہیں

پھر سگریٹ کا لمبا کش لیا چٹکی بجا کر راکھ کو جھاڑا اور اس تحقیر سے بادیلیر کا نام لیا کہ ہم گمان کرنے لگتے کہ بادیلیر تو چرکپن کے سامنے طفل مکتب ہے۔ پھر کبھی کبیر' کبھی میرابائی' کبھی جعفر زٹلی۔ زٹلی کے عصری شعور سے بات چلتی اور پھر پتہ چلتا کہ ایک شاعر اشرفی بھی تو تھا۔

کیچڑ میں کوڑی دیکھیں تو دانتوں سے لیں اٹھا
اے اشرفی زمانہ تو کنگال ہو گیا

پھر سگریٹ کا لمبا کش۔ چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی۔ عصری شعور اسے کہتے ہیں۔ اور ہمیں ساری ترقی پسند شاعری گھاس نظر آنے لگتی۔ اور شیخ صاحب ہیں کہ گم متھان بیٹھے ہیں۔ نہ تائید نہ تردید۔

تو ہمارے چھوٹے سے جنگل میں دو شیر ببر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کا باہمی نباہ روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب

یہ تیسرا شیر کا بچہ سعید محمود بیچ میں آن کودا۔

سچ پوچھو تو ہماری نئی نسل کو ان دو شیروں کی باہمی رقابت لے ڈوبی۔ خیر جب تک 'خیال' نکلتا رہا' خیریت رہی۔ مظفر کی ساری توجہ اس رسالہ کے حوالے سے آرٹ کی تنقید پر تھی یا بھجن اور گیت پر۔ مگر اس رسالہ کی عمر ہی نے وفا نہیں کی۔ تیسرا پرچہ بہر حال نکلا۔ مگر کن حالات میں۔ میں پھر ناصر سے رجوع کرتا ہوں۔

5 مارچ 1953ء کافی ہاؤس کے باہر گولی چلی۔ دن کو ساڑھے تین بجے کرفیو لگ گیا۔ لیکن لوگ اسی طرح چل پھر رہے تھے۔ رات بھر گولی چلتی رہی۔ بدنصیب اور غافل عوام اور لاپرواہ ظالم حاکم۔

میں کافی ہاؤس کی اس دوپہر کی نشست کو یاد کرتا ہوں۔ باہر ایک شور اٹھا۔ تحریک ختم نبوت کا ایک جلوس ساری رکاوٹیں توڑ کر مال پر آن پہنچا تھا۔ کافی ہاؤس کا دروازہ بند تھا۔ ہم نے بالائی منزل پر جا کر کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھا۔ رینجرز کا ایک دستہ بندوقیں تانے عین کافی ہاؤس کے سامنے مال پر قطار باندھے کھڑا تھا۔ جلوس امنڈا چلا آ رہا تھا۔ جب بالکل قریب آیا تو بس آناً فاناً گولی چلنی شروع ہوگئی۔ مال خونم خون ہوگئی۔

6 مارچ گھر سے نکلنا دشوار ہوا۔ ہر موڑ پر فوجیوں کے مورچے۔ آگ، قتل کی واردات۔

22 مارچ پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کی مجلس ہوئی۔ مارشل لاء کی وجہ سے وائی ایم سی اے کا ہال نہ مل سکا۔

28 شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے اور رات جاگ رہی ہے۔

یکم اپریل رسالہ ''خیال'' چھپ کر ملا۔

ہاں بس دوستوں ہی کو ملا۔ عام قارئین تک نہیں پہنچ پایا۔ بمشکل سٹال تک پہنچا۔ مگر کرفیو لگا ہوا تھا۔ کھلنے کے مختصر اوقات میں لوگ آٹا دال خریدنے کی فکر کرتے یا ''خیال'' خریدتے۔ ناشر نیا نیا اس میدان میں اترا تھا۔ یہ احوال دیکھ کر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ ''خیال'' بند ہوگیا۔

''خیال'' تو بند ہوگیا۔ مگر ''خیال'' کا خیال دل سے نہیں گیا۔ اس سے یاروں نے نئی نسل کے تصور کو وابستہ کر لیا۔ کہتے تھے کہ رسالہ بند ہوگیا تو کیا ہوا۔ ہم اسے تحریک بنائیں گے۔ پھر یاروں کو خیال آیا کہ تحریک شروع کر رہے ہیں تو اس کا کوئی منشور بھی تو ہونا چاہیے۔ منشور کون تیار کرے۔ قرعہ فال شیخ صاحب کے نام نکلا۔ شیخ صاحب نے انگریزی میں پوری شرح وبسط کے ساتھ منشور لکھا۔ ڈین ریستوران میں وہ سب لکھنے والے جو اپنے آپ کو نئی نسل جانتے تھے جمع ہوئے۔ ان کے ساتھ سب نئے مصور جمع ہوئے۔

مگر اس اجتماع میں کچھ اور ہی گل کھلا۔ منشور کی ہندی کی چندی کر دی گئی۔ مظفر اس میں پیش پیش تھا۔

بس اس کے ساتھ نئی نسل تتر بتر ہو گئی۔ ویسے تو مخالفت کرنے والے اکثریت میں تھے۔ چار یار ہی تو ایک طرف رہ گئے تھے۔ ناصر، شیخ صاحب، حنیف اور میں۔ رہا مشتاق سو وہ ڈانوا ڈول تھا۔ بہر حال اکثریت منظم نہ ہو سکی۔ تسبیح کے دانے بکھرے سو بکھرے۔

مگر ٹی ہاؤس میں بہت گہما گہمی ہے۔ اس کی رونق بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کافی ہاؤس کے کتنے باسی اب ٹی ہاؤس میں دیکھے جاتے ہیں۔ بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کافی ہاؤس اجڑ رہا ہے، ٹی ہاؤس کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ مصور ایک ایک کر کے کافی ہاؤس سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان کا رخ اب آرٹ کونسل کی طرف ہے۔ کافی ہاؤس کے کتنے دیوانے جو کافی ہاؤس سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے اب ٹی ہاؤس میں دیکھے جاتے ہیں۔ نواب ناطق اب وقتاً فوقتاً یہاں بیٹھے اور اپنی شاعری سناتے نظر آتے ہیں۔

''بمباق طریہا لک بمباق طریہا لک''

دروازہ کھلتا ہے اور ایک نرالی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ لمبا لگ لگ۔ بدن سینک، سلائی۔ بر میں ہرے رنگ کا ہاؤس کوٹ۔ گم سم۔ خاموشی سے آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

''لطیفی صاحب، چائے پیجئے گا۔''

ناصر کاظمی ان کا کتنا احترام کرتا تھا۔

''جی۔ اور دو توس بھی منگا لیجئے۔''

چائے آئی۔ چائے کے ساتھ دو توس آئے۔ لطیفی صاحب نے دونوں توس اٹھائے اور باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد خالی واپس آئے اور خاموشی سے چائے پینی شروع کر دی۔ لطیفی صاحب سے چائے کے متعلق جب بھی پوچھا انہوں نے ساتھ میں دو توسوں کی بھی فرمائش کی۔ اور ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ توس آ کر رکھے گئے اور وہ لے کر باہر نکل گئے۔ ایک روز میں کافی ہاؤس میں اس زاویے سے بیٹھا تھا کہ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ سامنے لطیفی صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بار بار دروازے کے شیشے پر ایک کتے کی تھوتھنی نظر آتی ہے۔ کوئی کتا کافی ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھ کر شیشے سے اندر جھانکتا تھا اور پھر اوجھل ہو جاتا تھا۔ میں حیران کہ یہ کتا آخر کیا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ویٹر نے پلیٹ میں دو توس لا کر رکھے۔ لطیفی صاحب نے دونوں توس رومال میں لپیٹے اور باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور ہمارے ساتھ کافی پینے لگے۔ پھر وہ کتا نظر نہیں آیا۔

ایک سہ پہر کو میں ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو اصغر سلیم کو سخت غصے کے عالم میں دیکھا۔ کہہ رہا تھا ''یار لطیفی صاحب عجب آدمی ہیں۔

آئے اور پوچھا کہ تمہارے پاس اٹھنی ہوگی۔ میں نے اٹھنی جیب سے نکال کر دیدی۔ انہوں نے اٹھنی جیب میں رکھی اور چلے گئے۔ یارحد ہوگئی۔ میری جیب میں ایک ہی اٹھنی تھی۔ سوچا تھا کہ چائے پیوں گا۔ اب میں کیا کروں۔"

"نہ دیتے۔" میں نے کہا۔

"یار انکار کیسے کرتا۔"

خیر بات آئی گئی ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے لطیفی صاحب بھی کسی طرف سے آن نمودار ہوئے۔ تھکے ہارے جیسے لمبی مسافت طے کر کے آرہے ہیں۔ جیب سے اٹھنی نکال کر اصغر سلیم کو واپس کی "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اصغر سلیم ہکا بکا "کیا بات ہوئی۔ اب کیوں ضرورت نہیں ہے۔"

"ہوا یوں کہ" لطیفی صاحب کہنے لگے "میں مزنگ کی طرف سے آرہا تھا۔ وہاں برگد کے نیچے ایک فقیر خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا اور اس سے کہا کہ تم یہیں رہنا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے لیے کچھ لے کر آؤں گا۔ میں آپ سے اٹھنی لے کر گیا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے مزنگ کی ایک ایک گلی چھان ماری۔ کہیں اس کا اتا پتہ نہیں تھا۔ جانے کہاں چلا گیا۔"

لطیفی صاحب کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ لدھیانہ کے صاحب ثروت لوگوں میں سے تھے۔ تقسیم کے ہنگام ہجرت کر کے لاہور آئے تو یہاں بے گھر، بے در ہو گئے۔ آج یہاں کل وہاں۔ سعید محمود انہیں اپنے گھر لے گیا۔ سعید محمود کا ایک شوق یہ بھی تھا کہ کسی ادیب میں جنون کے آثار دیکھتا اور وہ بے ٹھکانہ ہوتا تو اسے اپنے گھر لے جا کر مہمان رکھتا۔ منیر نیازی کو بھی تھوڑے دنوں مہمان رکھا تھا۔ مگر لطیفی صاحب نے اس گھر میں اچھے خاصے دن گزارے۔

سعید کا گھر میرے رستے میں پڑتا تھا۔ صبح ہی صبح جب میں سائیکل پر سوار دفتر کے لیے روانہ ہوتا تو سعید کے گھر کے احاطہ میں جو درخت تھے ان پر چڑیوں کے غول کے غول اترتے نظر آتے۔ چڑیوں نے سخت شور مچایا ہوتا۔ چند دنوں تک سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس راہ میں آخر اسی ایک گھر پر چڑیوں کی یورش کیوں ہوتی ہے۔ ایک دن لان پر جو نظر گئی تو دیکھا کہ لطیفی صاحب کھڑے ہیں۔ ان کے سر پر ان کے دونوں کاندھوں پر چڑیاں لدی ہوئی ہیں۔ باقی کچھ درخت سے اتر اتر کر ان کے گرد پھر پھر اڑ رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں۔ لطیفی صاحب کے ہاتھوں میں روٹی کے ٹکڑے یا دانہ دنکا قسم کی کوئی چیز ہے۔ وہ اسے بکھیر رہے ہیں۔

ایک رات آوارہ گردی کرتے کرتے بہت رات ہوگئی۔ سعید ساتھ تھا۔ ہم اس کے گھر کے قریب تھے۔ ناصر نے کہا کہ اب گھر کون جائے۔ آج سعید ہی کے گھر جا کر گھڑی دو گھڑی سو لیتے ہیں۔ صبح کو گھر جائیں گے۔ میرا گھر وہاں سے قریب تھا۔ مگر میں نے

بھی وہیں ڈیرا ڈال دیا۔ صبح ناشتے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ ناشتے سے ابھی ہم نے فراغت حاصل نہیں کی تھی کہ لطیفی صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے میز پر اپنا بڑا سا رومال بچھایا۔ حلوہ پوری' توس وغیرہ وغیرہ سب کو سمیٹ کر اس میں باندھا اور خاموشی سے نکل گئے۔ ہم ہکا بکا یہ کیا ہوا۔

اگلی شام میں اس راہ سے گزرا تو دیکھا کہ دو کتے سعید کے گھر کے گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں۔ اسی آن لطیفی صاحب ایک بڑا سا پڑا دونوں ہاتھوں میں سنبھالے برآمد ہوئے۔ دونوں کتوں نے انہیں اپنی اداؤں سے خوش آمدید کہا۔ پھر وہ برابر کی گلی میں مڑ گئے جہاں مزید کتوں نے اسی شان سے ان کا استقبال کیا۔

لطیفی صاحب ویسے بہت مصروف نظر آتے تھے۔ وجہ مصروفیت یہ بتاتے تھے کہ اپنی تحریروں کا انڈکس تیار کر رہا ہوں۔ انڈکس کی تیاری میں دفتر لکھے گئے مگر انڈکس پھر بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایک دن لطیفی صاحب نے بستر بوریا باندھا اپنے دفتر کو سمیٹا اور اس گھر سے چلے گئے۔ کتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میں نے ان کے جانے پر اس علاقے کے کتوں کا ردعمل معلوم کرنے کا تردد نہیں کیا۔ ہاں چڑیوں پر جوان کے جانے کا اثر ہوا وہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ صبح کو گزرتے ہوئے میں اس گھر پر ضرور نظر ڈالتا تھا۔ چڑیوں کی چہک مہک غائب ہو چکی تھی۔ کچھ دنوں تک تو یہ لگا جیسے اس علاقے کی چڑیاں چہکنا ہی بھول گئی ہیں۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ باقی سب پہ تو م۔ حسن لطیفی کی دیوانگی کا ایسا رعب تھا کہ وہ کچھ ہی کریں کوئی دم نہیں مارتا تھا۔ مگر عظیم قریشی اپنی طرز کے دیوانے تھے۔ لطیفی صاحب سے ٹکرا گئے۔ بولے "لطیفی تم کیا یہ لمبی لمبی نظمیں لکھتے ہو جیسے شیطان کی آنت۔ مجھے دیکھو دو مصرعوں میں مضمون سمیٹتا ہوں۔ یہ نظم لکھی وہ پھینکی۔"

عظیم قریشی کی شاعری بھی نرالی تھی خود بھی نرالے تھے۔ عمر ڈاک خانے کی ملازمت میں کٹی۔ شلوار قمیص اور کوٹ' یہ پہناوا تھا۔ ایک سائیکل دم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بیشک پیدل چلیں سائیکل کا ساتھ رہنا ضروری تھا۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھے کبھی نہیں پائے گئے۔ ٹی ہاؤس کے گیٹ پر سائیکل کے ساتھ کھڑے اکثر دیکھے جاتے تھے۔ سائیکل سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اور سائیکل لے کر ٹی ہاؤس کے اندر نہیں آ سکتے تھے۔ سو ٹی ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ پر محفل جماتے۔ ٹی ہاؤس سے جو نکلتا اسے روکتے۔ کہتے نظم ہوئی ہے۔ سنو۔ ان کی نظم سننے میں کسی کو کیا تامل ہو سکتا تھا۔ دو مصرعے ہوتے تھے۔ بہت لمبی کھنچی تو تین مصرعے۔ مگر کیا شاعری تھی۔ یا بالکل ٹھس۔ یا پھر جادو

یہاں پھول تھے اور وہاں پھول تھے
مگر چاند نے سب کے سب کھا لئے

عظیم قریشی نے میرا جی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ مگر رنگ ان کا اپنا تھا۔ پہلی کتاب شاید تقسیم سے پہلے رادھا کے گیت کے نام سے چھپی تھی۔ اب انہیں دنوں نیا مجموعہ ''آج کے نغمے کل کے شعلے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ کہنے لگے ''انتظار میاں' میں نے اپنا مجموعہ صرف تین شخصوں کو بھیجا ہے۔ پنڈت نہرو کو' چرچل کو اور برنارڈ شا کو۔''

میں نے کہا ''قریشی صاحب' پنڈت نہرو کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ مگر چرچل اور برنارڈ شا تو اردو نہیں جانتے۔ وہ آپ کی شاعری کیسے پڑھیں گے۔''

گرما کر بولے ''انتظار میاں' اگر چرچل اور برنارڈ شا کو عظیم قریشی سے استفادہ کرنا ہے تو انہیں اردو سیکھنی پڑے گی۔ کیوں کیسی کہی۔ لاؤ ہاتھ ملاؤ۔''

ہاتھ ملایا۔ سائیکل پہ بیٹھے اور یہ جا وہ جا۔

ایک دن مشرق میں آ کر جھانکا ''انتظار میاں' نظم ہوئی ہے۔ عنوان ہے ایٹم بم۔ نظم سنو:

اور ابلیس کی توہین کرو
اور ابلیس کی توہین کرو
اور ابلیس کی توہین کرو

کیسی کہی۔''

''بہت خوب ہے۔''

''مشرق میں چھپے گی؟''

''ضرور چھپے گی۔''

''پھر یہ لو۔ ہاتھ ملاؤ۔''

ہاتھ ملایا اور سٹاک سے کمرے سے باہر۔

عجلت میں تھے۔ ٹی ہاؤس کے سامنے دم بھر کے لیے رکے۔ سائیکل سے اترے۔ ہم کچھ دوست باہر کھڑے تھے۔

''نظم ہوئی ہے۔ سنو''

غنچہ بولا میں بھی زخمی
شعلہ بولا میں بھی زخمی
کتبہ بولا میں بھی زخمی

نظم ختم ہوئی۔ ہاتھ ملایا۔ سائیکل پہ چڑھ کر پیڈل پہ پیر مارا اور اڑنچھو ہو گئے۔ اب آپ نظم کے معنی ٹٹولتے رہیے۔

کبھی کبھی نظم ڈاک کے ذریعہ موصول ہوتی۔ خط اپنے ڈھنگ سے لکھتے تھے

میرے پیارے پیارے انتظار ادیب و نقاد زرنگار سید والا تبار۔ عزیزم سعادت آثار۔ روحی فداک مجتبیٰ۔ بارگاہ حسین میں نذارنہ فقیر صورت سلام اپنی جان۔ عظیم قریشی کا سلام بہ بارگاہ امام عالی مقام سید الشہیدا سیدنا حضرت امام حسین ابن علی ابن ابی طالب۔ مشرق کے محرم نمبر میں ضرور بالضرور شائع ہو جائے۔ حساب دوستاں در دل

گرویدہ انتظار

درویش عجز و انکسار

کشتہ آل اطہار

(آشم۔ فقیر) عظیم

عظیم قریشی کی سائیکل کا ذکر آیا ہے تو پھر مجھے کچھ اور سائیکلوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ اصل میں پاکستان میں ابھی سائیکل کا زمانہ چل رہا تھا۔ ٹی ہاؤس میں جو یار آتے تھے ان میں کچھ سائیکل سوار تھے کچھ پیدل تھے۔ اور پیادہ پائی کا چلن اتنا تھا کہ سائیکل موجود ہے مگر پیدل چل رہے ہیں۔ جب ہم سڑکیں ناپنا شروع کرتے تھے تو میں اپنی سائیکل ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر چھوڑ دیتا تھا مگر شیخ صاحب کی سائیکل ان کے ساتھ رہتی تھی۔ جتنا وہ چلتے تھے اتنا ہی ان کی سائیکل ان کے ساتھ چلتی تھی۔ ان کی سائیکل ان کی پیادہ پائی کا جز بن گئی تھی۔ اور ایک ہمارے قیوم صاحب کی سائیکل تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ اس وقت کسے اندازہ تھا کہ زمانہ ان سب سائیکلوں کو کھا جائے گا۔ آخر میں بس مبارک احمد کی سائیکل رہ جائے گی۔ بہر حال ٹی ہاؤس اس وقت صرف سائیکل آشنا تھا۔ نئی سواری جوٹی ہاؤس کے سائیکل سٹینڈ پر پہلے پہل نمودار ہوئی وہ شہرت بخاری کی موٹر سائیکل تھی۔

مگر قیوم صاحب کی سائیکل سب پر بھاری تھی۔ سوار بھاری تھا تو سواری کو بھی بھاری ہونا تھا۔ انہوں نے اس وقت حلقہ میں

Purge کا عمل شروع کرنے کی ٹھانی تھی۔ آخر نئی نسل کے حوالے سے ٹی ہاؤس میں جو بحثیں ہو رہی تھیں ان سے قیوم صاحب بے خبر تو نہیں تھے۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں حلقہ میں یہ بحث پہنچ گئی تو حلقہ والوں کا چال چلن بھی بگڑے گا۔ سو 16 جون 1954ء کو منعقد ہونے والے حلقہ کی انتظامیہ کے جلسہ میں ''انتظار حسین رکن حلقہ کے رویے کو زیر بحث لایا گیا۔'' اور محسوس کیا گیا کہ '' کچھ عرصے سے رکن مذکور نہ صرف حلقہ سے عدم تعاون کا ثبوت دے رہے تھے بلکہ حلقہ کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے تھے اور اس کی یک جہتی کو ہر طرح ضعف پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' لہٰذا'' طے پایا کہ انتظار حسین کو حلقہ کی رکنیت سے خارج کیا جائے اور مرکز کی توثیق کے بعد کھلے اجلاس میں اخراج کا اعلان کیا جائے۔'' انتظامیہ کے اگلے جلسہ میں طے پایا کہ ''ناصر کاظمی اور مظفر علی سید کے رویے پر کڑی نظر رکھی جائے۔'' اس کڑی نظر کے نتیجہ .....

نتیجہ میں یہ دونوں یار بھی حلقہ سے نکالے گئے۔ ادھر پنجاب یونیورسٹی کی سیاست بھی حلقہ میں دخل پا گئی تھی۔ پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی پر بھی انتشار پسندانہ سرگرمیوں کے الزامات لگے۔ انہیں بھی حلقہ سے نکال دیا گیا۔ لیجئے سب تخریبی عناصر کا قلع قمع ہو گیا۔ حلقہ پاک ہو گیا۔

◆◆◆

رتجگوں کی آخری بہار عرف چار پیاروں کی ٹولی

یہ سویرا کا دفتر ہے۔ رات بھیگتی جارہی ہے۔ چار یار اکٹھے ہیں۔ ناصر' شیخ صاحب' حنیف' میں۔ بحث جاری ہے۔ میٹرو سے ہجرت کر کے اب ہم سویرا کے دفتر میں آ گئے ہیں۔ حنیف ان دنوں ''سویرا'' کا مدیر تھا۔ اس دفتر میں اس کا ایسا جی لگا کہ ہمیں بھی اس نے یہاں کھینچ بلایا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میٹرو میں شور بہت ہوتا ہے۔ اطمینان سے بات نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنی جگہ سچا تھا۔ شور تو وہاں تھا۔ اور ایخلا جب فلور پہ نمودار ہوتی تھی تو میوزک اتنا تیز ہوجاتا تھا کہ شیخ صاحب بھی ایخلا سے اپنی بے اعتنائی کے باوجود گڑبڑا جاتے تھے۔ بھول جاتے تھے کہ فلاں مسئلہ پر برکلے نے کیا کہا تھا اور ہیوم نے کیا کہا تھا۔ اور ان سے پہلے ارسطا طالیس کیا کہہ چکا تھا۔ تو شیخ صاحب نے حنیف کی تجویز پر فوراً ہی صاد کر دیا۔

ویسے بھی اب حالات اور سے اور ہو چکے تھے۔ ناصر کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آوارگی اور شب بیداری کا گراف نیچے آ گیا۔ اور اب ڈار بھی لمبی نہیں رہی تھی۔ کتنے یار ڈار سے بچھڑ گئے تھے۔ نئی نسل میں تفرقہ پیدا ہو چکا تھا۔ مظفر اب ہماری ڈار میں شامل نہیں ہے۔ نور عالم بھی اس سبھا میں پابندی سے نہیں آتا۔ غالب شہر میں وارد ہو تو یہاں آن ٹپکتا ہے۔ مشتاق جب آتا ہے تو جلدی ہی بور ہو کر چلا جاتا ہے۔ پھر کئی کئی دن صورت نہیں دکھاتا۔ اسے بور ہونا ہی چاہیے۔ بحث کس قسم کی ہوتی ہے۔ فلسفہ' فلسفہ فلسفہ۔ شیخ صاحب تلے ہوئے ہیں کہ وقت کے مسئلہ کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔ ڈور کے سلجھانے میں حنیف برابر کا شریک ہے۔ بقدر توفیق ناصر بھی ٹکڑا لگاتا ہے۔ اور جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو وہ فلسفیوں کو ایک طرف دھکیل کر اپنے شاعرانہ تخیل کے زور پر زمان و مکان پر کمندیں ڈالتا ہے۔ ویسے اسے یہاں بیٹھ کر پتہ چل گیا ہے کہ تھیل کا فلسفہ کیا تھا۔

رہا میں تو مجھے ایک خاموش سامع شمار کیجئے۔ شاکر صاحب کے بعد اگر کوئی دوسرا ایسا تھا جو دانشورانہ بحثوں کے بیچ گھنٹوں کے حساب سے گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ سکتا تھا تو وہ میں تھا۔ اس محفل میں بیٹھ کر مجھے اب اس ہنر میں اور زیادہ مہارت ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی سوچتا کہ خدا اس صحبت کو سلامت رکھے' اگر یہ صحبت اسی طرح گرم رہی تو میں انشاء اللہ شاکر صاحب کا ریکارڈ توڑ کر اپنا نیا ریکارڈ قائم کروں گا۔

مگر اس بیچ کچھ اور باتیں بھی ہوئیں۔ آخر جو ہم لکھتے تھے وہ کہاں لے جائیں۔ چھپنا چھپانا بعد میں تھا۔ پہلے یہاں بیٹھ کر سناتے

تھے اور دوستوں سے داد لیتے تھے اور تنقید سنتے تھے۔ ناصر نے جو منظوم ڈرامہ لکھا تھا وہ پہلے میں نے یہیں بیٹھ کر سنا تھا۔ میں نے ایک کہانی لکھی وہ جو ''کٹا ہوا ڈبا'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جب لکھ چکا تو یہاں آ کر سنائی۔

جب کہانی ختم ہوئی تو حنیف بولا ''شیخ صاحب' آپ نے دیکھا۔ اس شخص نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔''

میں سٹپٹایا کہ یہ کیا ہوا۔

''وقت پر آپ نے جتنی بحث کی' یہ خاموش بیٹھا رہا۔ جب بھی میں نے ٹہوکا یہی کہا کہ میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا۔ گھنا آدمی ہے۔ سب سمجھ رہا تھا۔ سب کچھ افسانے میں سمیٹ لیا۔''

میں اب دوسرے پہلو سے سٹپٹایا۔ یا اللہ میں نے تو کہانی لکھی ہے۔ شیخ صاحب کے وقت کے فلسفہ کو کیسے سمیٹ لیا۔ مگر شیخ صاحب کو حنیف کی بات سے اتفاق تھا۔

میرا تب بھی یہی خیال تھا اور اب بھی یہی خیال ہے کہ نظریہ ہو یا فلسفہ لکھنے والا اس سے شوق کرنا چاہتا ہے تو بیشک کرے لیکن اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ جب وہ لکھنے بیٹھے تو اسے بھول جائے۔ اگر اس میں بھولنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اول الذکر صورت میں وہ نرا ترقی پسند ہو کر رہ جائے گا۔ دوسری صورت میں منظوم فلسفہ لکھے گا جو نہ فلسفہ ہوگا نہ ادب۔ بیشک لکھنے والے کو ان پڑھ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن خبر کے ساتھ تھوڑی بے خبری بھی ہو تو یہ لکھنے والے کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر اس وقت مجھے بحث تھوڑا ہی کرنی تھی۔ حلقہ میں بیٹھ کر ایک کام کی بات میں نے ضرور سیکھی۔ یہ کہ جب آپ کی تحریر زیر بحث ہو تو آپ اپنے منہ میں تالا ڈال لیں۔ جو کچھ کہا جائے اسے تحمل سے سنیں۔

تو خیر اس افسانے پر جب گفتگو ہو چکی تو حنیف نے اعلان کیا کہ سویرا کو ایک اچھا افسانہ مل گیا ہے۔

میں پھر سٹپٹایا۔ ''مگر یہ افسانہ تو میں ''نقوش'' کو دے چکا ہوں۔''

حنیف نے غصے سے مجھے دیکھا۔ پھر شیخ صاحب سے رجوع کیا ''شیخ صاحب' آپ نے انتظار کی حرکت دیکھی۔ اس نے ہم سے اجازت لی تھی۔ کس سے پوچھ کر یہ کہانی ''نقوش'' کو دی گئی ہے۔''

اب میں مجرم تھا اور کٹہرے میں کھڑا تھا۔

شیخ صاحب نے فیصلہ صادر کیا کہ افسانہ ''نقوش'' سے واپس لایا جائے۔

''مگر شیخ صاحب میرے لیے تو طفیل صاحب سے جا کر کہنا کہ افسانہ واپس دیدو بہت مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ تو بہت غیر اخلاقی